سوال نمبر
سوال نمبر
سوال نمبر
سوال نمبر
سوال نمبر

ANS 01

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت تعارفِ محتاج نہیں مولوی عبد الحق بلند پائے کے ادیب مشہور ومعروف تحقیق وتنقید نگار تھے۔ اعلیٰ پائے کے مترجم اور تاریخ داں، انکی شخصیت میں مزید بلندی، انکے خاکوں کی وجہ سے بھی ہوئی۔ ''چند ہم عصر'' اس کی زندہ مثال ہیں۔ ''چند ہم عصر'' کو اردو خاکہ نگاری کی روایت میں بے مثال اہمیت حاصل ہیں۔ اپنے خاکوں میں انھوں نے انھیں لوگوں کو شامل کیا جن کی شخصیت قابل تعریف ہوں اور جس سے ہمیں سبق مل سکے۔ انھوں نے ایسی شخصیت کا انتخاب کرکے اپنے خاکوں کو اور بھی اہمیت بخشی ہے۔

''چند ہم عصر'' میں مولوی عبدالحق نے اپنے ان معاصرین کی سیرت کو اجاگر کیاہے جن سے انھیں زندگی کے کسی بھی موڑ پر قربت رہی ہے۔ ''چند ہم عصر'' نہ صرف ادبی حیثیت سے اہم ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی معتبر ہے اس کے ذریعے جہا ں ہم مختلف شخصیتوں سے واقف ہوتے وہیں مولوی عبدالحق کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی یہ کتاب مدد گار ثابت ہوئی ہے۔

خاکہ نگاری کے جدید ترین فن میں مولوی عبدالحق جو حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں صرف رشید احمد صدیقی انکے شریک ہیں۔ دونوں کے فن میں جو فرق ہے وہ ان کے مزاج اور نقطہ نظر کا ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ''مولانا محمد علی جوہر'' پر دونوں کی رائے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ''چند ہم عصر'' کے خاکے پڑھنے سے بڑی حد تک یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے دور سے لیکر مولوی عبدالحق کے دور تک مسلمانوں نے علم وفضل اور شعر وادب کے میدان میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان خاکوں میں کہیں کہیں طنز ومزاح کے ہلکے پھلکے چھینٹے بھی نظر آتے ہیں۔

بحیثیت خاکہ نگار مولوی عبدالحق کا درجہ بہت بلند ہے۔ انکی خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے ''چند ہم عصر'' میں نظر آتے ہیں۔ در حقیقت جس خلوص اور لگن سے وہ کام کرتے ہیں ان کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بددلی اور

تھکن کا احساس مولوی عبدالحق کی تحریر میں ہے ہی نہیں۔ اس کا ثبوت وہ جدوجہد ہے جو اردو کی ترقی کے لیے مولوی عبدالحق نے ہندوپاک میں کی۔ مولوی عبدالحق کو اردو سے جو عشق ہے وہ ان کی تحریروں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ مولوی عبدالحق اور اردو ایک ہی شخص کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں۔ ’’چند ہم عصر‘‘ میں جہاں جہاں انہیں موقع ملا وہ اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے کہ اردو زبان ہی بہترین تعلیمی ذریعہ ہو سکی ہے۔ اردو کی ترقی واشاعت مولوی عبدالحق کی زندگی کا نصب العین رہا ہے اور اس کا ایک عملی نمونہ کراچی میں اردو کالج کا قیام ہے۔

مولوی عبدالحق نے نہ تو اردو سے دامن چھڑایا اور نہ اس کی ترقی کی طرف سے بددل ہوئے۔ ماں باپ بھی اولاد کے جوان ہونے پر اس کی طرف سے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق اردو سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے اور شاید اسی وجہ سے قوم نے انھیں ’’بابائے اردو‘‘ کا خطاب دیا ہے۔ جو ہر طرح سے ان پر جچتا ہے۔ مولوی عبدالحق اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہے۔ انھیں اگر اردو ادب کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے ذریعہ بھی اردو ادب کی خدمات انجام دی ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصر رفیقوں اور ادیبوں کی شخصیتوں کو اپنے خاکوں میں پیش کیا ہے۔ جس میں انھوں نے چوبیس شخصیتوں کے سیرت اور ان کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ جسے ہم ان کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ انکے خاکے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انھیں شخصیتوں کی تصویر پیش کی ہے جن سے انکا زندگی میں واسطہ پڑا۔ ان کے خاکوں میں ادیب بھی ہیں، شاعر بھی، سیاست داں بھی ہیں، مذہب کے پرستار بھی، امیربھی ہیں، غریب بھی یعنی ہر طبقے اور درجے کے اشخاص سے انھیں دلچسپی تھی۔

’’چند ہم عصر‘‘ میں طویل اور مختصر دونوں طرح کے خاکے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق کا سب سے طویل خاکہ ’’سر سید احمد خاں‘‘ کا خاکہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا سب سے اہم حصہ ان کے ہم عصر رفیقوں اور ادیبوں کی موت ہے۔ مولوی عبدالحق نے جتنے بھی خاکے لکھے ہیں وہ ان کی وفات کے بعد ہی تحریر میں لائے گئے ہیں۔ یہ تھی ان کی عقیدت جو انھیں اپنے ہم عصر رفیقوں سے تھی۔ جو انھیں ان کی وفات کے بعد ان پر قلم اٹھانے سے روک نہ سکیں۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ ان کی تحقیقی نظر اور اسلوب بیان ہے ۔ مولوی عبدالحق کو ایسے شخص دل سے عزیز تھے جو سچائی کا پیکر ہو۔ اور ایسے شخص بھی جن سے کسی کو رنج نہ پہنچا ہو دراصل یہ سب خوبیاں خود ان کی اپنی ذات کا حصہ تھی جیسے وہ اپنے خاکوں میں تلاش کرتے تھے۔ چونکہ بنیادی طور پر مولوی عبدالحق ایک محقق اور نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے خاکوں میں تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ روز مرّہ کے محاورات بھی بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں مولانا حسرت موہانی، نورخاں، نام دیومالی، حالیؔ، علامّہ اقبال اور خالدہ ادیب کے خاکے دلچسپ ہیں ان خاکوں میں شخصیت کے اخلاقی پہلوئوں اور ایثار وقربائی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود خاکے کے کینوس پر بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر تصنیف اپنے مصنف کے خیالات، جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر ''چند ہم عصر'' کو دیکھا جائے تو اس میں بہترین کردار نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں اور ذاتی واقفیت اور سماجی پس منظر کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صرف ''چند ہم عصر'' ہی لکھتے اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیا جاتا۔مولوی عبدالحق کا اصل جوہر ان کے اسلوب بیان کی خوبی میں ہے۔ جس کا آغاز سرسید اور حالیؔ سے ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عبارت آرائی اور محاورے کا بے جا استعمال نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق کا اسلوب سلیس اور واضح ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحریروں میں سرسید جیسی سادگی ہے۔ مولوی عبدالحق کے اسلوب کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو جو چیز سب نے زیادہ نظر آتی ہے وہ عربی فارسی کے الفاظ کے مقابلے میں عام بول چال کی زبان ان کے یہاں زیادہ نظر آتی ہے اور یہی ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔اسلوب ایک ایسا انداز بیان ہے۔ جس کی وجہ سے ادیب اپنے پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور ان کے دل میں گھر بنا لیتا ہے۔ ایک ادیب میں کم سے کم اتنی صلاحیت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ذہنوں کو مطمئن کرسکے۔ یہ خصوصیت جتنی مولوی عبدالحق کے یہاں نمایاں ہے۔ اتنی کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ انھوں نے جس کسی بھی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ چاہے مقدمات ہوں یا خطبات، تنقیدات ہوں، یاانشائیے، کسی بھی میدان میں ان کے قلم کی روانی سست نظر نہیں آئی۔ ''چند ہم عصر'' کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈگر ڈگر پر ہم مولوی عبدالحق کے ہم قدم ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ''چند ہم عصر'' میں مولوی عبدالحق نے اپنے معاصرین کے خاکے پیش کیے ہیں۔ اور معاصرین میں بعض عزیز ہستیاں بھی ہوتی ہیں اور جتنی زیادہ عزیز ہوتی ہیں ان کے بارے میں لکھنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق کی یہ صداقت ہے کہ جس کے بارے میں جو جو خیال ان کے ذہن میں آتے گئے وہ اس کا اظہار کرتے گئے اپنے معاصرین کے مثبت اور منفی دونوں پہلو اجاگر کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن جب وہ یہ کام انجام دے گئے تو خاکہ نگار سے زیادہ زندگی کے نقاد معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے اسلوب میں ایک وقار اور ایک رکھ رکھائو آجاتا ہے

ANS 02

بیسویں صدی میں انشائیہ کو تنقیدی اور تخلیقی ہر دو سطحوں پر متعارف کر نے والوں میں نظیر صدیقی اس صنف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان میں جو بات انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ انشائیہ میں طنز کی شمولیت ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ شہرت کی خاطر اپنی تحریروں میں اسی خصوصیت کے ساتھ انشائیہ کا ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتا ہے۔ بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ نظیر صدیقی کی ظرافت چونکہ طنز کی جراحت سے

حد درجے آشنا ہے اسی لئے انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں انشائیہ کے متعلق اپنے نظریات میں اسی عنصر پر زور دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

' میں جن حالات و حوادث سے گزرتا رہا ہوں ا ن کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصّے کا شکار رہی ہے یہی غم و غصّہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصّہ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ 1

نظیر صدیقی انشائیوں کو متضاد عناصر کا مرکب قرار دیتے ہوئے جن مختلف عناصر کے اتصال پر انشائیہ کو کھڑا دیکھتے ہیں ان میں سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کے علاوہ حکمت سے حماقت تک کے مرحلے، بے خودی میں ہشیاری اور رندی میں مستی کا شمار ہے۔

وہ انشائیہ کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک ساری منزلیں طے کی جا تی ہیں۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جا تے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اجاگر کی جا تی ہے۔ یعنی Sense میں Non Sense اور Non Sense میں Sense ڈھونڈا جا تا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے با وجود سنجیدہ اورسنجیدہ ہو نے کے با وجود غیر سنجیدہ یعنی بالفاظِ غالبؔ لکھنے والے کی بے خودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بے خودی پا ئی جا تی ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ اور کہیں جھوٹ میں سچ کی آمیزش ہو تی ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جا تی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کا نام بھی۔ '

یہ سچ ہے کہ انشائیہ نثر اور غنائیت، احساس اور تفکر، داخل اور خارج کا نقطہ اتصال پیش کرتا ہے لیکن نظیر صدیقی جن دو آفاق کو انشائیہ کی زمین پر باہم مربوط کرتے ہیں وہ اردو میں ایک نئی چیز ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں بھی حکمت سے حماقت تک کے تمام مرحلے طے ہو تے نظر آ تے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں شخصیت طنز کے وار پر ہی اپنا اظہار کرتی ہے۔ ان کے ایک مضمون کا اقتباس درج ذیل ہے۔

'غنڈو ں کے بار ے میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ایک غنڈہ ہر آ دمی کے اندر ہو تا ہے اور باقی غنڈے شہر کے اندر ہوتے ہیں۔ جب کسی مقصد کی تکمیل میں اندر کے غنڈے سے کام نہیں چلتا تو باہر کے غنڈے بلائے جا تے ہیں۔ بڑے بڑے انقلابوں کو ممکن بنانے میں غنڈوں کا جو ہاتھ رہا ہے تاریخ میں اس کا اعتراف کہیں نہیں ملتا اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ تاریخ صرف حقائق اور واقعات کے اندراج سے عبارت نہیں بلکہ بہت سے حقائق اور واقعات کے اخفاء سے بھی عبارت ہے۔ 2

نظیر صدیقی نے اپنے انشائیہ ' غنڈے ' ہی کی طرح 'امتحان گاہ ' میں بھی موضوع کو ایک وسیلہ کے طور پر اختیار کیا ہے جس کی مدد سے وہ سماج ملک اور قومی مزاج کے علاوہ عصری زندگی کے حقائق طشت از بام

کرتے چلے گئے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں انشائیہ نگار کی بصیرت اور سوجھ بوجھ کے شواہد قدم قدم پر ملتے ہیں ان کی تحریریں بیسویں صدی میں تخلیق ہو نے والے انشائیوں کے درمیان ایک نئی آ ب و ہوا کا احساس دلاتی ہیں۔

ANS 03

''مٹی کا دیا'' مرزا ادیب کی خودنوشت سوانح عمری ہے ۔یہ پہلی بار جولائی۱۹۸۱میں شائع ہوئی۔اشاعت سے پہلے اس خودنوشت سوانح عمری کے کچھ حصے سیارہ ڈائجسٹ ،اردو ڈائجسٹ ،قومی ڈائجسٹ اور ماہِ نو جیسے مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوئے تھے ۔

مرزادیب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کے ابتدائی ابواب میں اپنے بچپن کے ایام ، تعلیم وتربیت ،والدین اورگھریلوماحول کے علاوہ اپنے خاندان کے سبھی لوگوں کا بھر پور تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی داستانِ حیات کا آغازخودنوشت کے عین فنی تقاضے کے مطابق اپنی پیدائش کے متعلق تفصیلات بہم پہنچانے سے کیا ہے :

''شہر لاہور کا بھاٹی دروازہ بہت پرانا بھی ہے اوربہت مشہور بھی۔ اس کے اندر ہی محلہ ستھاں اور محلہ ستھاں کے مرکزی علاقے کوچوک دیوی دتا کہاجا سکتاہے ۔ چوک دیوی دتا کے پہلو سے ایک گلی نکلتی ہے جو کچھ دور جاکر ذرا اپنا رخ بدل کر ایک چھوٹی سی گلی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ گلی ''مغلاں''کہلاتی تھی۔ اس کی وجہ تسمیہ غالباًیہ تھی کہ یہاں میرے دادا جان میرزا غلام حسین نے دومکان خرید رکھے تھے اوراپنی گلی کے علاوہ ارد گرد کی آبادی میں بھی انہیں بڑااثرورسوخ حاصل تھااس گلی میں داخل ہوں تو چند مکانوں کے بعد بالکل سامنے ایک دومنزلہ گھر نظرآتاہے جو کافی پرانا ہوچکا ہے مگر آج بھی اس کی اپنی ایک شان ہے اپنا ایک جلال ہے اورایک دن اور یہ دن ہے ۴،اپریل ۱۹۱۴ء کا۔

یہی وہ دن ہے جب اس مکان کے آخری کمرے میں جسے گھر والے ''پرلا اندر'' کہتے تھے میں نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا۔'' ؎۱

مرزا ادیب نے اپنے پچپن کے حوالے سے جو حالات وواقعات تحریر کیے ہیں اس سے پتہ چلتاہے کہ ان کا بچپن ایک ایسے گھرانے میں گزرا ہے جس کے درو دیوار پر مفلسی نے گہرے پہرے ڈالے ہوئے تھے۔ خاندان میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا ، ماں باپ سے لے کر دوسرے رشتہ داروں تک سبھی علم کے نور سے بے بہرہ تھے ۔ ان کے ذہن و دل پر فرسودہ روایات کا گہرا غبارچھایا ہوا تھا ۔پوراخاندان بے حسی کی ایک مجسم تصویر بنا ہوا تھا ۔اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا،تنگ دستی کا ،بھوک پیاس کا ،قدامت پرستی کا،جمود و تعطل کا ۔غرض ان کے ارد گرد کا ماحول اتنا تاریک تھا کہ وہ کسی بچے کوایک روشن مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا ۔

بچپن میں دادی کے گھر منتقل ہوئے تووہاں بھی انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ دادی نے پڑھائی کے بجائے ایک بڑھئی کے پاس کام سیکھنے بھیجا جوان سے زیادہ تر حقہ تازہ کرنے ، آگ جلانے اورچلم بھر نے کا کام لیتا تھا۔ بڑھئی کے بعد دادی نے انہیں ایک لوہار کے سپردکیا لیکن وہ یہاں بھی زیادہ دیر تک نہ رہ سکے ۔ اس

کے بعد خاندان والوں نے انہیں لاہور کے بھاٹی دروازہ کے پرائمری اسکول میں داخل کیا۔یہ ان کی پہلی کامیابی تھی کیوں کہ خاندان میں ان سے پہلے کسی نے اسکول نہیں دیکھا تھا ۔ بعد میں انہوں نے کالج میں بھی تعلیم حاصل کی لیکن اس سفر میں انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑاہوگااس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے اسی طرح کے ماحول اور حالات دونوں کو عملی سطح پر جھیلا ہو۔

مرزا ادیب نے اپنی تعلیمی زندگی کاتفصیل سے تذکرہ کیاہے۔ انھوں نے پرائمری اسکول سے لے کر کالج تک کی زندگی کے متعلق بھر پور معلومات بہم پہنچائی ہے۔ انھوں نے اس عہد کی تعلیم وتربیت کے طریقوں اورطلبہکے ساتھ اساتذہ کی سخت گیریوں کا بھی تذکرہ کیاہے جس سے ان کے عہد کے اسکولوں اوراساتذہ کی مکمل تصویرآنکھوں کے سامنے پھرجاتی ہے۔انہوں نے اپنے کالج کے ان اساتذہ کا ذکر بھی پوری عقیدت اور ارادت کے ساتھ کیاہے جن سے ان کو کالج کے ایام کے دوران استفادہ کرنے کا موقع ملا یا جنہوں نے ان کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا ۔

تعلیم و تربیت کے ذیل میں مرزا ادیب نے اپنی والدہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں جو حالات تحریر کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نیک اور روشن خیال خاتون تھیں۔ اس کی زندگی اگرچہ دکھوں ،پریشانیوں اور تنگ دستی کے حصار میں بندھی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ تمام عمر ایثار کے جذبے سے معمور رہیں ۔اس میں زندگی کو بانٹنے اوراسے دوسروں کے روشن مستقبل کے لیے واقف کرنے کی بے پناہ قوت موجود تھی ۔اس کے اردگرد کے لوگ اور ماحول دونوں پر پرانی روائتوں کا آلودہ غبار چھایا ہوا تھا لیکن ایسے حالات میں بھی، پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود اس کا ذہن روشنی سے منور تھا ۔اس کی زندگی میں دکھ درد کے میلے صبح شام جلوہ نما رہتے تھے لیکن اس نے خود کو کبھی بکھرنے نہیں دیا ۔اس نے ہر ایک کو اہمیت دی جو اس کے قابل بھی نہیں تھا اسے بھی عزت بخشی ۔اسے دوسروں کا خیا ل اپنی ذات سے زیادہ رہتا تھا ۔گھر میں سب کو کھانا کھلاکر جو کچھ بچ جاتا اس سے اپنا پیٹ بھر لیتی تھی۔ اس نے اپنی ذات پر کبھی کچھ خرچ نہیں کیا ۔بیمار ہوتیں تو ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جانے کے بجائے گھریلو نسخوں سے اپنا علاج کرتی ۔تنگ دستی اور غربت میں زندگی بسر کرنے کے باوجود اس نے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی کے سامنے قسمت کی شکایت کی۔اس نے جس حال میں بھی زندگی بسر کی صبر وسکون سے سرشار رہیں ۔اس کو زندگی میں مختلف مقامات پرمختلف حالات میں مختلف کردار ادا کرنے پڑے ۔لیکن وہ ہر مقام پر گہرا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہیں ۔وہ ایک اچھی بیٹی ،نیک بیوی اور شفیق ماں تھی ۔اس نے قدامت پرست ماحول میں بھی بچوں کی تعلیم پر توجہ دی ۔مرزا ادیب کی تربیت پر اس نے زیادہ دھیان دیا ۔ہر چند کہ ان کے شوہر اور گھر کے دوسرے لوگوں کو تعلیم میں کوئی دل چسپی نہیں تھی ۔اس نے مرزا ادیب کی تعلیم کے سبھی اخراجات خود پورے کیے فیس ادا کرنے سے لے کر کتابیں خریدنے تک لیکن اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ۔ ان کے احسانات بہت وسیع ہیں ۔اگر وہ نہ ہوتیں تو دلاور علی کبھی مرزاادیب نہ بنتا ۔اگر ان کا سایہ مرزا ادیب کے سر پر نہ

ہوتا تو وہ علم کے نور سے بے بہرہ رہ کر کسی مستری ،لوہار یا بڑھی کے ہوکر رہ گئے ہوتے اس طرح اردو ادب بھی ’’صحرا نورد کے خطوط‘‘ اور’’صحرانوردکے رومان ‘‘جیسے ادبی شاہ کار کارناموں سے محروم رہ جاتا ۔

مرزا ادیب نے اپنی والدہ کا ذکر جذبات میں ڈوب کر کیا ہے ۔انھوں نے اپنی والدہ کی زندگی کے ہر گوشے کو اجاگر کیا ہے ۔ان کے مزاج ،کردار ،پسند و ناپسند سب پہلوؤں پر بڑی عقیدت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔آپ بیتی کے اس حصے پر جس میں والدہ کا خاکہ موجودہے، جذباتیت کی گہری فضا چھائی ہوئی ہے ۔ اس میں ماں کی ممتا او ر ایک نیک اور صالحہ اولاد کی اپنی ماں سے محبت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے ۔نیزوالدہ کا کردار اس انداز میں سامنے آتا ہے کہ وہ سب کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت اختیار کرجاتا ہے ۔ اس کی زندگی اور اس کا ہر عمل قاری کو اس طور پر متاثر کرتا ہے کہ وہ ہر سطح پر اس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے لگ جاتا ہے ۔مرزا ادیب نے اپنی والدہ کا محض ایک خاکہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان پر لفظوں اورخوبصورت جملوں کے ذریعے سے اپنی محبتوں اور گہری عقیدتوں کے پھول نچھاور کیے ہیں ۔خاکے کے آخر میں اس محبت اور عقیدت کا دل چسپ اظہار ہوتا ہے :

’’مری امی اس دنیا میں نہیں ہیں ،مگر یہ کس کا ہاتھ ہے جو مایوسیوں کے ہجوم میں میرے سر پر آہستہ آہستہ پھرنے لگتا ہے ؛

یہ کس کی انگلیاں ہیں جو میرے گیلے گالوں کو چھونے لگتی ہیں اور سارے آنسو خشک ہوجاتے ہیں ؛

یہ کس کا چہرہ ہے جو تاریکیوں میں طلوع ہوکر ہر طرف روشنی بکھیر دیتا ہے ؛‘‘ ؎۲

(ص ۲۹۷)

مرزا ادیب نے کالج کے زمانے تک کی زندگی تنگ دستی اور مالی پریشانیوں میں بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے فوراًبعد ہی روزگار کے لیے تگ ودوکا آغاز کیا۔ ان کے لیے حصولِ معاش ہمیشہ ایک اذیت ناک مسئلہ رہا۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’یہ نہیں کہ یہ مسئلہ اس وجہ سے اذیت ناک تھا کہ مجھے فاقے کرنے پڑتے تھے یا تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر نہیں ہوتاتھا۔ یہ صورت نہیں تھی۔ جس گھر میں پیدا ہواتھا وہ خاندان کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ زرعی اراضی سے اتنی آمدنی ہوجاتی تھی کہ افرادِ خانہ کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکیں گر چہ یہ ضرورتیں ناپ تو ل اور کھینچا تانی کے حساب سے ہی پوری ہوتی تھیں۔ اگر گھر میں کوئی دنیاوی امور کی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور کاروبار ی معاملات کو سمجھنے والا فرد موجود ہوتاتھا تو اچھی خاصی گزراوقات ہو سکتی تھی۔ خوش حالی کا دور دورہ ہو سکتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ دونوں تایا جی ایسے معاملات میں صفر کا درجہ رکھتے تھے۔ رہ گئے ابا جی تو وہ گفتگو کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں جانتے تھے۔ امی بے چاری کا بہت کم اختیار تھا۔ ان کو جو کچھ ملتاتھا۔ اس سے گھر کا خرچ ہی پورا ہوتاتھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس آمدنی کی سطح بھی بالعموم یکساں نہیں رہتی تھی۔کبھی کبھی مزارع ٹھیکے کی مقررہ رقم دیتا ہی نہیں تھا تو گھر میں اقتصادی بحرا ن آجاتا تھا۔ ایسے موقع پر امی ایک ایک پیسہ کر کے جمع کی ہوئی رقم سے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلاتی تھیں۔‘‘ ؎۳

اس اقتباس کی روشنی میں مرزا ادیب اوران کے گھر کی مالی پریشانیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتاہے ۔ ’’مٹی کا دیا‘‘ کے مطالعے سے پتہ چلتاہے کہ مرزا ادیب نے تلاش معاش کے سلسلے میں سب سے پہلے دسمبر 1935میں پنجاب بک ڈپو کے مالک چودھری برکت علی کے کہنے پر ادبی ماہ نامہ ’’ادب لطیف‘‘ کی ادارت پچیس روپے ماہوار تنخواہ پر قبول کی۔ یہ ان کی زندگی کاایک اہم فیصلہ تھا اور یہیں سے باضابطہ طورپر ان کی عملی اور ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوتاہے ۔ اس لمحے کو یاد کر تے ہوئے لکھتے ہیں:

’’وہ لمحہ میری زندگی کا ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے ایک نہایت اہم فیصلہ کرلیا۔ جب میں نے اپنے لیے وہ راستہ اختیار کرلیا جو دوسرے سب راستوں سے الگ تھلگ تھا۔ اس راستے پر چلتے ہوئے باربار کانٹوں سے میرے پاؤں زخمی ہوگئے۔ لگا اب چل نہیں سکوں گا۔ کبھی کبھی میں نے اپنی امی کی آنکھوں میں مایوسی کے سایے بھی دیکھے۔ اپنے خوابوں کے پھولوں کو زہر بھری ہوا کے جھونکوں سے مرجھا تے ہوئے بھی پایا۔ کبھی کبھی کسی شاداب راستے نے بھی مجھے اپنی طرف بلایا۔ مگر میراسفر جاری رہا۔ ایک بعیدی افق پر جھلملاتی ہوئی روشنیاں ہمیشہ مجھے آگے ہی آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی رہیں اور میں برابر چلتا رہا۔ اب تک چل رہاہوں وہ بعیدی آج بھی روشنیوں سے معمور ہے آج بھی اس کے سینے سے روشنیاں پھوٹ رہی ہیں۔‘‘ ؎۴

’’ادب لطیف‘‘ کی ادارت نے مرزا ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انھوں نے اس رسالے کی ادارت کے دوران کئی افسانے اورڈرامے لکھے۔ جب بھی رسالے کا کوئی خاص نمبر چھپتا تواس میں مرزا ادیب کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں ۔ اس رسالے کے ذریعے سے مرزادیب کو اپنے ہم عصر مشاہیرِ ادب سے تعلقات استوار کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔ ’’ادب لطیف‘‘ سے الگ ہونے کے بعد مرزا ادیب نے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر ’’مصور‘‘ کی ادارت کی۔ ’’مصور‘‘ ایک فلمی ہفت روزہ تھا۔ اس رسالے میں فلموں سے متعلق خبریں اور اشتہار ات چھپتے تھے۔ اس رسالے کا ادب سے بہت کم تعلق تھا۔ مرزا دیب نے اپنی ادارت میں اس رسالے کو ادبی رنگ دیا۔ اس میں فلموں سے متعلق خبروں کے ساتھ ساتھ نظمیں ، افسانے، غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

ANS 04

بیگم اختر ریاض الدین انگریزی ادب پڑھاتی ہیں، شہرت اردو ادب میں ملی۔ سفر نامے لکھے، بہت پسند کیے گئے۔ اسلوب کی تعریفیں ہوئیں۔ مولانا صلاح الدین لکھتے ہیں۔ ’’ان کے طرز بیان میں ایک ماہرانہ گرفت اور ایک فنکارانہ آراستگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور وہ ہلکا ہلکا مزاح جو ان کی نگارش گوہریں میں ایک سلکِ ریشمیں کی طرح بل کھاتا چلا جاتا ہے اس کی سب سے دلکش خصوصیت کا امتیاز رکھتا ہے۔ پھر وہ جس بے ساختگی اور بے تکلفی سے آپ کو جاپان کے خیابانوں اور گیشاخانوں، صنعت و تجارت کے ہنگامہ زاروں اور تعلیم و تربیت کے دبستانوں کی سیر کراتی ہیں، اسی خوبی سے آپ کا ہاتھ تھام کر روس کے برفستانوں اور عجائب خانوں اور مقبروں اور زیارت گاہوں میں لیے پھرتی ہیں۔‘‘

اختر ریاض الدین کے سفرنامے ''دھنک پر قدم'' میں جو اب سے کوئی ساٹھ سال پہلے شایع ہوا تھا، چھ مقامات کی سیر کا بیان ہے۔ ان میں ایک سفر جزائر ہوائی کا تھا۔ لکھتی ہیں ''جزائر ہوائی، مٹی کی ننھی ننھی بوندوں کی طرح پچھلے چالیس ہزار سال سے بے کراں سمندر میں کئی دفعہ ابھرے اور کئی دفعہ ڈوبے، لیکن شاباش ہے وقت کو! اس کا صبر، اس کا ظرف غیر محدود ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اور یہ نامعلوم جزیرے جن کے سینے میں آگ اور جن کی سطح پر جزگیاہ کچھ نہ تھا، بتدریج اوراق ہستی پر اہمیت اختیار کرتے گئے۔''

ہوائی سات جزیروں پر مشتمل ہے۔ ایک جزیرہ اوواہو اس لیے مشہور ہے کہ اس کا مرکز ہنولولو ہے۔ اختر ریاض احمد لکھتی ہیں ''اگر کوئی مجھ سے ایک لفظ میں ان جزائر کی صفت بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گی، ملائم۔ ان کے باشندے ملیح و ملائم، ان کی زبان نرم و شیریں، ان کے گیت، ان کے رقص، ہلکے پھلکے۔ ان کی ساری کائناتی اور معاشرتی فضا سہل قدم۔ ان جزائر میں اونچی آواز سے بولنے کو جی نہیں چاہتا کہ کہیں ان کی ہم آہنگی چٹخ نہ جائے ۔کرخت لہجہ یا درشت الفاظ میں وہ انجان دہقان معلوم ہوں گے۔

یہ جزائر صرف مہر و محبت کے لیے تھے۔ ان کی خونیں اور تیرہ بخت تاریخ سے قطع نظر یہ آبی سلطنت انسان کو انسانیت کے لیے دی گئی تھی۔ یہاں کوئی موسم کی بات نہیں کرتا کیونکہ ضرورت ہی نہیں۔ گرمی اور سردی کے درجہ حرارت میں صرف دو ڈگری کا فرق ہے۔ میرے لیے اس جزیرے کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی تھی، ایک روحانی و ذہنی آزادی۔ یہاں نہ کوئی بیگم جانے، نہ مادام ۔ کسی کو آپ کے نام سے واسطہ نہیں۔ سب اپنی اپنی تفریح اپنی اپنی تفتیش میں مست۔ یہاں عمر کا فرق اور ذات پات کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔''

بیگم اختر ریاض الدین لندن کے سفرکا ذکرکرتی ہیں۔ کہتی ہیں ''لندن! یہ کیا شے ہے! یہ پیچیدہ پراسرار سحر! یہ کالونسی دھواں مارا۔ بارش زدہ نیم تاریک شہر! یہ خوبی معاشرت کا دھڑکتا دل! اس کے فنون کی آن و عصمت۔ اس لندن کو کن الفاظ میں بیان کروں؟ اس کے ساتھ میری بچپن سے ہزاروں یادیں وابستہ ہیں۔''

اختر بتاتی ہیں کہ لندن سے ان کی ملاقات تین بار ہوئی۔ پہلی دفعہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے، دوسری مرتبہ ایک مانوس شہری کی مانند اور آخری بار ایک عاشق دیرینہ کی طرح ۔ پہلی دفعہ لندن میں صرف آٹھ دن قیام رہا۔ اس دوران میں وہ سب دیکھا جو سب دیکھتے ہیں، ٹاور آف لندن کا کوہ نور ہیرا ، ٹرافیلگر اسکائر، سینٹ پال گرجا گھر، تھیٹر۔ دوسری بار جب اختر کے میاں، ریاض الدین صاحب امپریل ڈیفنس کالج کے کورس پر لندن گئے تو یہ ان کے ساتھ ایک سال وہیں رہیں۔ لکھتی ہیں ''یہ پورا سال میری زندگی کا سب سے یادگار سال ہے۔''

تیسری بار جب بیگم اختر ریاض الدین لندن گئیں تو لندن تو وہی تھا لیکن وہ بدلی ہوئی تھیں۔ یہ ستمبر 1946 کا زمانہ تھا جب جنگ نے دل و دماغ ماؤف کردیے تھے۔

ایک مرتبہ امریکا میں قیام کے دوران انھوں نے میک کو جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ شہر انھیں اتنا اچھا لگا کہ دوبارہ جانے کی شدید تمنا رہی۔ لکھتی ہیں ''امریکا کی امارت اور سرد مہری کے بعد میکسیکو اور بھی مانوس اور نیم مشرقی معلوم ہوا۔ پھر اس کی فضا۔ زندگی کی رفتار امریکا سے کس قدر مختلف۔ یہاں سڑکوں پر لوگ چل رہے

تھے، بھاگ نہیں رہے تھے۔ خوب گھومنے کے بعد شہر کا نقشہ بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ یہ شہر جتنا بڑا ہے اتنا ہی ایک سیاح کے لیے آسان بھی ہے۔ جب تک کوئی مہا بدھو نہ ہو یہاں کھویا نہیں جاتا۔ بہت کم شہروں کی ترتیب میں تاریخ نے اتنا موثر حصہ لیا ہے۔'' اختر ریاض الدین کو لندن اور پیرس کی آوارہ گردی کے بعد اگر کہیں مزہ آیا تو میکسیکو میں۔ ویسے تو شہر میں بہت سے باغ ہیں لیکن چپل تو پیک پارک عوام کو بہت پسند ہے۔ یہ اسی نام کے قلعے اور محل کے اردگرد ہے۔ لکھتی ہیں ''میں نے کتنی شامیں یہاں گزاریں اور اب بھی اکثر شاموں کو بیٹھے بیٹھے میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور وہ پارک یاد آتا ہے۔''

اختر نے اپنے سفرنامے میں سان فرانسسکو کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک شہر نہیں، شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے۔ امریکا میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک تنوع ہے۔ اس کے جغرافیے میں تنوع ، معاشرے میں تنوع، شہری خدوخال میں جدت، باشندوں میں ہمہ گیر اختلاف ۔ یہ امریکا ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس شہر نے امریکا کی لاج رکھ لی ہے۔ یہ جتنا نیویارک کی فضا سے دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی انسانیت کے قریب آتا جاتا ہے۔ انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ ہے۔ فراخ دل، یہودی صفت، حسین، غلیظ، روشن، تاریک۔

کبھی ہنگامہ خیز، کبھی خاموش۔ بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی۔ متعصب مگر پھر بھی روادار۔ اس کی کون تشریح کرے۔ اس شہر کی تاریخ ضعیف ہے، یہ خود جوان ہے۔ یہ اپنے افسانوی گزشتہ ''طلائی تمدن'' کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے۔ خاموشی سے سنیں تو اس کے سمندری ساحلوں کی بلند موجوں میں کئی شور پنہاں ہیں۔ شروع میں آبی پرندوں کے غولوں کا، پھر ازلی باشندوں کے منتروں کا، کبھی برطانیہ کے ''سمندری کتوں'' کا کبھی قدیم مبلغوں کی کلیسائی گھنٹیوں کا۔ اس شہر کا سب سے نرالا راز یہ ہے کہ اس میں بے شمار ننھی پہاڑیاں ہیں اور ہر پہاڑی میں ایک مخصوص علاقہ بسا ہوا ہے۔''

آٹھ برسوں کے درمیان بیگم اختر ریاض الدین نے نیویارک کو تین دفعہ بخوبی دیکھا، پرکھا، برتا۔ لکھتی ہیں ''پہلی دفعہ ہمارا نیویارک سے تعارف کا شگون کچھ نیک نہ نکلا۔ سوائے موسم کے اور کسی نے ساتھ نہ دیا۔ کفایت شعاری کے مدنظر زیر زمین ٹرین سے سفر کیا تو ٹیوب اسٹیشن ایسے معلوم ہوئے گویا تاریک بھیانک زنداں۔ پھر طرح طرح کے نمونے آپ کے پیچھے سیٹی بجاتے اور آوازیں کستے ہیں۔مجھے لندن کی کسی ٹیوب میں ڈر نہ لگا۔ رات گیارہ بجے اکیلی آتی جاتی تھی۔ نیویارک میں میری سٹی گم ہوئی اور توبہ کی آیندہ ٹیکسی لوں گی ۔ نیویارک ایک بے سروپا دیو ہے۔ یہاں پہنچتے ہی انسان بوکھلا جاتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔''

اختر ریاض الدین تین دفعہ امریکا میں داخل ہوئیں اور نکلیں۔ اس درآمد برآمد میں انھوں نے امریکا کا ہر دفعہ ایک نیا رخ دیکھا۔ سب ہی ملکوں میں معاشی اور معاشرتی زندگی میں تضاد ہوتے ہیں لیکن انھیں جیسے تضادات امریکا میں نظر آئے ویسے اور کہیں نہیں دیکھے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ نوع انسان کی تاریخ میں پہلی قوم ہے جس کا بنیادی مسئلہ

دولت کی کمی نہیں بلکہ افراط ہے۔ اکثر سیاح اس ملک سے خوشگوار یادیں بھی لاتے ہیں لیکن شخصیات اور ملک کی روش دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اختر ریاض الدین کو ہانگ کانگ جانے کا بھی موقع ملا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ کا ہانگ کانگ پر قبضہ تھا۔ لکھتی ہیں ''تیسرے پہر ہمارا ہوائی جہاز دو چار بادلوں کے جھرمٹ میں اترنا شروع ہوا ۔ جزیرے کے خط و خال ابھرے۔ کہیں کہیں دھوپ کے دھبے کہیں کہیں چھاؤں کی چھائیاں۔ پرسکون پانی، نیا ہوائی اڈہ عین دو پانیوں کے بیچ بنایا گیا ہے۔ جہاز اس طرح پانی کو چیرتا ہوا اترتا ہے گویا آب دوز کشتی ہے۔ کم ازکم اس کے پَر تو ضرور چھینٹے اڑاتے ہوں گے۔ ہوائی اڈہ کشادہ۔ کسٹم افسران، اسگملروں کے باوجود باتمیز اور پھرتیلے۔ ٹیکسی تیز اور سستی۔ مغربی ہوٹل مہنگے، چینی سرائے ٹکے سیر۔ بازار رات کے بارہ بجے تک کھلے ہوئے۔ سڑکوں پر ساری رات رونق، ایک جاندار اور جوشیلا شہر ہے یہ ہانگ کانگ۔ آپ اس سے کبھی بیزار نہیں ہوسکتے۔

ANS 05

یوں تو ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور ہنسانا آتا ہے، درست ہے کہ "ہنسنا"خوشی کے احساس کا نام ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہر ہنسی خوشی کا اظہار ہوا کرتی ہے، کیونکہ جو لوگ اپنے دکھ درد اپنے دل میں چھپا کر ہنس رہے ہیں ان کی ہنسی، دل لگی اور مذاق کو کیا نام دینا چاہیے۔ صرف ہنسنے اور ہنسانے کا عمل مزاح نہیں، مزاح نہ لطیفہ گوئی ہے ، نہ تضحیک نہ طنز۔ اس کے لیے لہجے کی ظرافت، عظمت خیال اور کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ مہذب جملوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح وہی ہے جو بظاہر تو ہلکی پھلکی لطافت اور ظرافت میں ڈوبی تحریر لگے لیکن قاری کو لطیفے پر قہقہہ لگا کر بھول جانے کے بجائے یکلخت اس تحریر کی گہرائی میں جا کر سنجیدگی سے اپنے آپ کا جائزہ لینے پر مجبور کر دے۔ رد عمل بجلی کی چمک کی طرح ذہن میں اس طرح کوندے کہ اسے لگے کہ کسی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔اور ایک ایسا مزاح جو جذبات کو مجروح کیے بغیر، اور کسی کی دل آزاری سے عاری ہو وہ صرف مطالعے ہی سے وجود میں آتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کو نفسیات انسانی اور جذبات انسانی کا مکمل شعور تھا، ان کی تحریروں میں طنز اور مزاح اصلاح معاشرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے اس عرق ریزی کے ذریعے اپنے قارئین و سامعین کو زمانے کی تلخیوں سے روشناس کرواتے رہے ہیں، اور اپنی زندہ جاوید ہستی سے اچھا اور مثبت مزاح تخلیق کرتے رہے ہیں۔ ان کا ہر مضمون ہم جیسے ایک عام آدمی کا ایسا خاکہ ہے جس میں کروڑوں انسانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری تہذیب اور ثقافت کی تصویر ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ایک رجحان ساز اور صاحب اسلوب مزاح نگار تھے ، انہوں نے نہ صرف اردو ادب کو مزاح کے میدان میں بے پایاں عزت دی بلکہ جدید اسلوب سے اس کی خوبصورت تشکیل بھی کی ۔

مشتاق احمد یوسفی 4 اگست 1921ءمیں ہندوستان کی ریاست ٹونک(راجھستان) میں پیدا ہوئے،ان کا آبائی وطن جے پور جسے "پنک سٹی" بھی کہا جاتا ہے تھا جہاں انہوں نے گریجوایشن تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علی گڑھ

یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا اور 1950ءتک بھارت میں ڈپٹی کمشنرکے عہدے پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب ان کے والدین نے پاکستان ہجرت کی تو وہ بھی 1956ءمیں کراچی منتقل ہوگئے ۔ یہاں انہوں نے بنکاری کے پیشے کا انتخاب کرتے ہوئے مسلم کمرشل بنک سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا، جہاں وہ بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ترقی کرتے کرتے بینک کے صدر بنے، اور پھر یونائیٹڈ بنک کے بھی صدر رہے، لیکن اعلیٰ عہدوں پر خدمات کے باوجود ان کی اصل پہچان اردو کی مایہ ناز مزاح نگاری بنی۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز"مشتاق احمد" کے قلمی نام سے کیا، 1955ءمیں ان کا پہلا باقاعدہ مطبوعہ مضمون "صنف لاغر" معروف ادبی جریدے ماہنامہ "ادب لطیف" کے مدیر میرزا ادیب نے شائع کیا۔ اردو زبان وادب کے صف اول کے ادیبوں میں شمار کیے جانے والے مشتاق احمد یوسفی کے مزاح کی خصوصیت ان کا منفرد انداز ہے۔ آپ لفظوں سے کھیلتے اور موقع ومحل کی مناسبت سے ان کے خوب صورت بر جستہ استعمال سے ایک نئے معانی عطا کردیتے تھے۔ اور ایک تخلیق کار کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ ہنس ہنس کر اور ہنسا کر زندگی کو گلے لگاتا ہے۔ یوسفی صاحب طنز و مزاح نگاری کے لیے مضمون، آپ بیتی، خاکہ، تاریخ، مرقع، افسانہ، ناولٹ، ناول جیسی اصناف کو استعمال میں لائے اور انہوں نے مزاحیہ نثر میں بدنظمی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہونے دیا۔ مزاح کے اس معیار پر جب ہم مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی مزاح کی معراج پرتھے۔ یوسفی صاحب نے پانچ مقبول عام کتابوں ، چراغ تلے 1961، خاکم بدہن 1969، زرگزشت 1976ء، آب گم 1990، شامِ شعر یاراں2014، کی صورت میں اردو ادب کو مزاح کے بہترین نمونوں سے نوازا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے اردو مزاح میں شاندار خدمات کے اعتراف مینمشتاق احمد یوسفی کو 1999ءمیں ستارہ امتیاز اور 2002ءمیں ہلال امتیاز سے نواز ا گیا۔ ان کی پر لطف کتابوں کے بارے میں ابن انشا نے لکھا تھا کہ "یوسفی صاحب کی کتاب منگوائی ہے اور ابھی تک پڑھی نہیں کیونکہ اگر پڑھ لیا تو ختم ہوجائے گی اور اگلے دس سال تک یہ کوئی کتاب نہیں لکھیں گے"۔ اپنی تحریروں مینمعاشرتی پہلوو ٔں کا بغورمشاہدہ اور ان پر بطریق احسن طنز کی طبع آزمائی بھی یوسفی کا کمال خاصہ تھا۔ جب معاشرتی برائیوں کو طنز کی زدمیں لاتے تودلچسپ پہلوؤں پر گدگداتے فقرے جست کرکے حیرت میں ڈال دیتے ، بدلتے انسانی رویوں کونشتر مزاح پر اس شائستگی سے رکھتے کہ قاری انکی بات پر مسکرائے اور اثبات میں سر ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ دنوں ان کی دوسری برسی پر یہ یقین ہی نہیں ہوپارہا تھا کہ مزاح کا عہد یوسفی اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے، ان کی وفات سے اردو ادب میں معیاری مزاح نگاری کا خلاءشاید کبھی پر نہ ہوسکے۔

شتاق احمد یوسفی کی چند خوبصورت تحریریں ملاحظہ کریں۔

-(1) میرا خیال ہے کہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے یا پھر وہ خود ہی حالات حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔

-(2) اندرون لاہور کی چند گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ اگر ایک طرف سے مرد اور دوسری طرف سے عورت گزر رہی ہو تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

-(3) جو اپنے ماضی کو یاد نہیں رکھنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔

-(4) سمجھدار آدمی نظر ہمیشہ نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے۔

-(5) مجھے اس پر قطعی تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج تعویز، گنڈوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔

-(6) بناؤ سنگھار ہر عورت کا حق ہے، بشرطیکہ وہ اسے فرض نہ سمجھ لے۔

-(7) بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دینے کا جی چاہتا ہے، خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

-(8) ایک فرنچ ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہیں کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔

-(9) موسم، معشوق اور حکومت کا گلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی، تفریحی مشغلہ رہا ہے۔

-(10) مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں، پھر بحث کرتی ہیں مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ مقبول نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے